اشارات

خُرم مراد

۳۰ اکتوبر ۱۹۹۱ کو اسپین کی سرزمین پر 'میڈرڈ کے مقام پر 'امریکہ کی نیو ورلڈ ڈپلو میسی بالآخر اس بات میں کامیاب ہوگئی کہ اس نے عرب مسلمان ممالک کو اسرائیل کی یہودی ریاست کے سامنے گھٹنے ٹیک کر معاہدۂ امن کی بات چیت شروع کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور اسطرح امریکہ' (اور روس 'جس کا الگ سے نام لینا اب اس لیے ضروری نہیں کہ وہ امریکہ کا تابع اور ضمیمہ بن کر اس کے ساتھ بریکٹ ہو کر رہ گیا ہے) کی بلائی ہوئی نام نہاد "مشرقِ وسطیٰ امن کانفرنس" کا آغاز ہو گیا۔

آج سے ٹھیک ۵۰۰ سال پہلے '۲۵ نومبر ۱۴۹۱ کو' اسی اسپین کی سرزمین پر 'میڈرڈ سے تقریباً ۲۰۰ میل جنوب میں 'غرناطہ کے مقام پر اسپین کی آخری عرب مسلمان ریاست کے حکمران ' ابو عبداللہ محمد نے 'ناکہ بندی 'فاقہ مستی احسان مندی' اور خوف و طمع کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسپین کی عیسائی ریاست کے حکمرانوں 'فرڈی نینڈ اور ازابیلا اور ان کی فوجوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے 'اور "حصولِ امن" کے نام پر ہتھیار ڈالنے کے معاہدہ پر دستخط کر دیئے۔ اس صلح نامہ کے تحت ابو عبداللہ نے یہ وعدہ کیا کہ ۶۰ روز کے اندر وہ غرناطہ کا شہر' الحمرا کا قلعہ' اور تمام سامان جنگ عیسائیوں کے حوالے کر دے گا۔

اس صلح نامہ کے لیے 'جو اسپین میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے پروانۂ موت تھا' ساری بات چیت ابو عبداللہ اور اس کے وزرا نے بالکل خفیہ اور عامتہ المسلمین کو بالکل بے خبر رکھ کر کی ۔ کیونکہ تمام مسلمان' مہینوں کی ناکہ بندی اور فاقہ کشی 'تعداد کی قلّت اور اسلحہ کے فُقدان کے باوجود' طارق بن زیاد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی جانیں نثار کر کے جہاد کے لیے آمادہ

تھے ۔ لیکن یہ وزرا و امرا کی مجلسِ مشاورت تھی‘جس میں شہر کے علما و شیوخ بھی موجود تھے‘ جس نے تقریباً" یک زبان ہو کر کہا کہ عیسائی ریاست سے صلح کرلی جائے‘ اس لیے کہ اگر ہم جنگ ہار گئے تو عیسائی ایک مسلمان کو بھی زندہ نہ چھوڑیں گے ۔ ایک طرف ابو عبد اللہ نے اپنے وزیر ابوالقاسم عبدالملک کو خفیہ طور پر فرڈی نینڈ کے پاس بھیجا‘ جو رات کو قلعہ سے باہر جاکر عیسائیوں سے ملاقات کرتا‘ اور صلح نامہ کی شرائط طے کیا کرتا تھا۔ دوسری طرف شہر کے اندر عیسائی امرا دوستی کے پردہ میں خواص و عوام میں رشوتوں کا جال بچھا کر ان کو کھوکھلا کر رہے تھے۔

اس صلح نامہ کے ساتھ ساتھ ‚جس میں غرناطہ کے عام مسلمانوں کو مستقبل میں امن و تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی‘ ایک اور معاہدہ بھی ترتیب دیا گیا۔ اس میں ابو عبداللہ کے لیے خصوصی مراعات کی ضمانت دی گئی تھی ۔ جب عام مسلمانوں اور فوج کو اس صلح نامہ کی تباہ کن اور ذلت آمیز شرائط کا علم ہوا تو وہ اس کے خلاف ہو گئے ۔ابو عبداللہ نے گھبرا کر‘ کہ کہیں عوام بغاوت پر نہ اتر آئیں اور بنا بنایا کام نہ بگاڑدیں‘ ساٹھ روز پورے ہونے سے پہلے ہی فرڈی نینڈ کو پیغام بھیج دیا کہ عیسائی قصر الحمرا اور غرناطہ پر فوراً" قبضہ کرلیں۔

۲ جنوری ۱۴۹۲ کو‘ ادھر عیسائی فوجیں غرناطہ میں داخل ہوئیں‘ اُدھر اسپین میں آخری مسلمان حکمران ‘ابو عبداللہ محمد‘ اور اس کے اہلِ خاندان اور ساتھی ‘زرق برق ریشمی کپڑوں میں ملبوس اور ہیرے جواہرات سے لدے پھندے‘ قصر الحمرا سے برآمد ہوئے ۔ فاتح غرناطہ کو داخل ہوتے دیکھ کر ابو عبداللہ گھوڑے سے نیچے اتر پڑا ‘اس کے گھوڑے کی باگیں تھام لیں‘شہر کی چابیاں بصد عجز و نیاز اس کے حوالے کیں ‘اور عرض کیا "یہ کنجیاں اسپین میں عربوں کے اقتدار کی آخری نشانی ہیں ۔ آپ انہیں لے لیجیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق ہمارا ملک ‘ہمارے مال اور ہماری جانیں سب آپ کی ملکیت ہیں ۔امید ہے کہ آپ نے جیسا وعدہ کیا ہے اسی کے مطابق معاملہ کریں گے" ۔ فرڈی نینڈ نے ابوعبداللہ کو یقین دلایا کہ "مسلمانوں سے جو وعدے کیے گئے ہیں انہیں پورا کیا جائے گا" (احسان الحق‘مسلمان یورپ میں‘ص ۲۹۳)

الحمرا کے بلند ترین برج پر چاندی کی صلیب آویزاں کر دی گئی‘ اور اسپین سے اسلام اور مسلمانوں کا ۷۸۱ سالہ پرانا نام و نشان مٹانے کا عمل شروع ہو گیا۔ عہد نامۂ امن میں مسلمانوں کو ان کے جان و مال اور دین و ایمان کی سلامتی و تحفظ کی جو ضمانتیں دی گئی تھیں‘وہ اپنی جگہ کاغذ پر بڑی دل خوش کن تھیں۔ مثلاً کسی مسلمان کے جان و مال کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے گا‘مسلمانوں کو اپنے مذہب پر چلنے‘ اپنا لباس پہننے‘ اپنی زبان بولنے‘اپنی رسوم منانے‘اپنے

معاملات شریعت کے مطابق طے کرنے کی پوری آزادی ہو گی' مساجد اور اوقاف برقرار رہیں گے' تین سال تک کوئی ٹیکس نہیں لیا جائے گا اور اسکے بعد بھی کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا جائے گا۔ اتنے دل خوش کن وعدے' حیرت ہوتی ہے' یہ کیسے یقین کر لیا گیا کہ ان کو پورا کیا جائے گا۔ مگر دشمنوں سے امیدوں اور ان پر اعتماد کے سوراخ سے مسلمان کتنی ہی دفعہ ڈسے گئے ہیں۔

عیسائی حکمرانوں کی یہ نیت بالکل نہ تھی کہ وہ کوئی بھی وعدہ پورا کریں گے' خواہ وہ ابوعبداللہ جیسے یار وفادار ہی سے کیوں نہ ہو۔ اس سے البشرات کے علاقہ کی حکومت کا وعدہ تھا' لیکن جلد ہی اس کو مراکش جلا وطن کردیا گیا۔ مسلمانوں کو عیسائی بنانے یا نیست و نابود کرنے کے لیے ہر قسم کے ظلم و جور کا دروازہ کھول دیا گیا۔ جلد ہی ۱۴۹۹ میں ان تمام مسلمانوں کو جو عیسائیت قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے' اسپین سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ ۱۵۰۲ میں ایسے تمام مسلمانوں کے قتل کا فرمان جاری کر دیا گیا۔ اس طرح ان مسلمانوں کے علاوہ جو جان کے خوف سے عیسائی بن گئے تھے' باقی سارے مسلمان زندہ جلا دیئے گئے' یا قتل کر دیئے گئے' یا اسپین سے نکال دیئے گئے۔ بظاہر عیسائی بن جانے والوں کی مزید چھٹائی کے لئے ۱۵۲۶ میں شاہی فرمان کے ذریعہ عربی لباس پہننے' عربی زبان بولنا' اسلامی رسوم و رواج منانا' اسلامی نام رکھنا' یہاں تک کہ غسل کرنا بھی جرم قرار دے دیا گیا۔ کتابیں جلائی گئیں' حمام مسمار کر دیئے گئے' مساجد کو گرجا بنا لیا گیا۔

۱۴۹۱ میں غرناطہ کے عہد نامۂ امن کے بعد چند سال کے عرصہ میں قسم کھانے کو ایک بھی خدا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے والا اس اسپین کی سرزمین میں باقی نہ رہا جہاں مسلمانوں نے ۷۸۱ سال حکومت کی تھی۔

> کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔ کتنے ہی عیش کے سروسامان' جن میں وہ مزے کر رہے تھے' ان کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا ان کا انجام' اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث کر دیا۔ پھر نہ آسمان ان پر رویا نہ زمین' اور ذرا سی مہلت ان کو نہ دی گئی۔ (الدخان ۲۵-۲۹)

۱۹۹۱ میں "مشرق وسطیٰ امن" کے نام پر ہونے والی کانفرنس اسپین میں کیوں رکھی گئی؟ اس سوال کا قطعی جواب مشکل ہے۔ توجیہات بے شمار ہو سکتی ہیں' لیکن کیا یہ سوچنا بالکل

بعید از قیاس ہو گا کہ کانفرنس منعقد کرنے والوں کے ذہن و نفسیات میں اسپین کا انتخاب کرتے وقت اسپین میں اسلام اور عرب مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے کی ۵۰۰ سالہ برسی اور عرب مسلمان حکومتوں اور مغربی حکمرانوں کی پروردہ یہودی ریاست اسرائیل کے درمیان امن و صلح کی بات چیت کے آغاز کے درمیان کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رہا ہو گا۔ خصوصاً" مغرب کے اس کلچر سے تعلق رکھنے والوں کے ذہن میں' جہاں ہر فرد کی ہر سالگرہ بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہے۔ کیا عرب مسلمان شرکاء کو انجام سے متنبہ کرنا مقصود ہے؟ یا' ان پر نفسیاتی دباؤ ڈالنا پیش نظر ہے؟ یا' یہ امن و صلح کی بات چیت انتقام کے اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے ' جس کی ایک کڑی "سقوطِ غرناطہ" تھا؟ یا ' یہ صرف اپنے تحت الشعور کی نفسیاتی تسکین کا سامان ہے؟

جواب جو کچھ بھی ہو ' یہ سمجھنے کے لئے کہ میڈرڈ کانفرنس سے امریکہ کیا حاصل کرنا چاہتا ہے ' ہمیں امریکہ ــــ اسرائیل ــــ فلسطین / عرب / مشرقِ وسطیٰ کے مثلث کے تاریخی پس منظر کی نقاب کشائی کرنا ہو گی۔ پوری بات تو شاید اسی وقت کھل کر سامنے آئے گی جب مغرب ـــ اسلام تعلقات کی طویل تاریخ کی گرہیں کھولی جائیں ' لیکن پھر بات بہت پھیل جائے گی۔

مغرب اور اسلام کے تعلق کی تاریخ ہو' یا امریکہ اور مغربی طاقتوں کی طرف سے اسرائیل کے قیام و بقا' اس کے تمام ناجائز عزائم و اقدامات کی مکمل اور غیر مشروط تائید' اور ہر مرحلہ پر اس کی بھرپور عسکری' مالی ' اخلاقی ' اور پروپیگنڈائی پشت پناہی کی تاریخ ' جو اس سے واقف ہو اسے اس بات میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ امریکہ کو مشرق وسطیٰ میں امن کے قیام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ سوائے ایسے امن کے ' اور اس حد تک امن کے ' کہ جس سے اس کے اور مجموعی طور پر مغرب کے عزائم پورے ہوتے ہوں اور ان کے مفادات کا تحفظ ہوتا ہو۔ نہ اس کے پیش نظر حق و انصاف کی بنیاد پر وہاں کے مسائل حل کرنا ہے۔ مغربی طاقتوں کے نزدیک ' جن کی امامت دوسری جنگ عظیم کے وقت سے امریکہ کے پاس ہے' مشرقِ وسطیٰ میں انسان ــــ مرد' عورت اور بچے ـــ نہیں بستے' بلکہ وہاں اس تہذیب اور دین کے وارث اور ماننے والے بستے ہیں جس کے ماننے والے ایک ہزار سال تک مغرب کے لیے سب سے سنگین مسئلہ اور خطرہ بنے رہے۔ اور وہاں وہ تیل بستا ہے جو مغرب میں خوشحالی کے چراغ جلائے رکھنے کے لئے ناگزیر ہے۔

پہلی جنگ عظیم (۱۸ - ۱۹۱۴) میں جوں ہی مغرب کو اپنی فکر اور اپنے نظام کے کھوکھلے پن کا احساس ہوا' اور اس کے مسلسل ترقی کے خواب بکھر گئے ' اس نے اپنی تاریخ کے سب سے سنگین مسئلے ' یعنی اسلام کے حل کی تدابیر اختیار کرنا شروع کر دیں' تاکہ وہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکے۔ ایک طرف عربوں اور ترکوں کو لڑا کر خلافت عثمانیہ کو پارہ پارہ کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ دوسری طرف مشرقِ وسطیٰ پر اپنا تسلط جما کے' اس کو ایسی چھوٹی چھوٹی کمزور ریاستوں میں بانٹ کے جو کبھی اپنے دفاع کے قابل نہ ہو سکیں' وہاں اپنے تابعدار و باجگزار حکمران بٹھا کے ' قوم پرستی کا فسوں پھونک کے' ان کو ہمیشہ کے لئے باہم برسرِپیکار رہنے کا سامان کر کے ' اس بات کا انتظام کیا گیا کہ وہ کبھی بھی سر نہ اٹھا سکیں ' نہ کبھی مغرب کے تسلّط سے آزاد ہو سکیں۔ تیسری طرف' یہ اندازہ کر کے کہ بدلتے ہوئے حالات میں دور دراز ممالک پر براہ راست سیاسی و عسکری تسلط نہ ممکن ہو گا نہ اس کے اخراجات قابل برداشت' خود مشرقِ وسطیٰ ہی میں ' فلسطین میں اسرائیل کی ایک ایسی ریاست قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جو وہاں کی سب سے بڑی غالب عسکری اور اقتصادی طاقت ہو اور مغرب کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔ گویا اب صلیبی سورما بھیجنے کی ضرورت نہ پڑے' بلکہ یہودی ریاست ان کے حصے کا کام کرے۔

اتنے " اہم تہذیبی مقاصد " کی تکمیل کی راہ میں خود فلسطین میں بسنے والوں کا مقام اور اہمیت ان ریڈ انڈینوں سے زیادہ نہ ہو سکتی تھی ' نہ ہے' جو امریکہ میں بستے ہیں۔ چنانچہ لارڈ بالفور نے ' جس نے ۱۹۱۷ میں فلسطین میں اسرائیلی ریاست کے قیام کے منصوبہ کا اعلان کیا تھا' ۱۹۱۹ میں ہی اپنے ایک میمورنڈم میں لکھا:

> ہم فلسطین میں وہاں کے باشندوں کی رائے معلوم کرنے کی کسی ظاہری کوشش میں پڑنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں رکھتے... چار بڑی طاقتوں (یعنی برطانیہ ' فرانس' روس اور امریکہ) کی وابستگی صیہونیت کے ساتھ بالکل مکمل ہے۔ اس لئے کہ صیہونیت ' حق ہو یا باطل اور اچھی ہو یا بری' یہ ماضی کی ایسی قدیم روایات پر قائم ہے' اور اس پر عصر حاضر کے ایسے تقاضوں ' اور مستقبل کی ایسی امیدوں کا انحصار ہے' جو اس بات سے کہیں زیادہ دقیع اور اہم ہیں کہ اس قدیم سرزمین میں بسنے والے سات لاکھ عرب کیا چاہتے ہیں اور کیا سوچتے ہیں۔

اگر مغربی طاقتوں کے نزدیک فلسطینیوں کو حال اور مستقبل کے عزائم کی خاطر بالکل

نظر انداز کیا جا سکتا ہے' تو یہودی تو فلسطینیوں کے وجود ہی سے انکاری ہیں۔ اسرائیلی وزیراعظم 'گولڈا میئر کے الفاظ میں "ایسا نہیں ہوا کہ وہاں ایک فلسطینی قوم بستی تھی... ہم آئے اور ہم نے ان کو نکال کر باہر پھینک دیا ---- نہیں' ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا"۔

فلسطینیوں کے وجود کو اہمیت دینے یا ان کو تسلیم کرنے کا منطقی نتیجہ ایک فلسطینی ریاست کا قیام ہے' اسرائیل کی تباہی نہیں ۔ مگر فلسطینی ریاست نہ مغربی طاقتوں کے لئے قابل قبول ہے' نہ اسرائیل کے لئے ۔ اس لیے کہ یہ ان طویل المیعاد مقاصد کی راہ میں رکاوٹ ہے جو اسرائیل مغرب کی خاطر' مغرب کی شہ پر ' اور مغرب کی مکمل پشت پناہی سے' حاصل کرنے میں مسلسل لگا ہوا ہے۔ ان مقاصد کی واضح نشان دہی ' اسرائیل کے قیام سے پہلے ہی ' امریکن جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے ایک ٹاپ سیکرٹ (انتہائی خفیہ) پیپر (نمبر ۱۱ / ۱۶۸۴ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۴۸) میں کر دی گئی تھی۔ یہ مقاصد محض اسرائیل کے نہیں' بلکہ مغرب کے بھی ہیں :

۱۔ ابتدا میں فلسطین کے ایک حصے پر یہودی اقتدار۔

۲۔ پھر' فلسطین میں یہودیوں کا غیر محدود داخلہ (جو اب تک جاری ہے)

۳۔ پھر' پورے فلسطین پر یہودی اقتدار کی توسیع۔

۴۔ پھر' اردن' لبنان' شام (بلکہ اس سے بھی آگے) "ارضِ اسرائیل" کی توسیع۔

۵۔ پھر' پورے مشرقِ وسطٰی پر اسرائیل کا فوجی اور معاشی تسلّط ۔

امریکن جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے الفاظ میں "اس پروگرام کے سارے مرحلے یہودی لیڈروں کے نزدیک یکساں طور پر مقدّس ہیں"۔ (اور امریکہ و مغرب کے لئے یکساں طور پر اہم)

اسی لیے امریکہ اور اسرائیل پی ایل او کا وجود تسلیم کرنے یا اس سے کسی قسم کی بات چیت کرنے سے بالکل انکاری ہیں۔ ایک اسرائیلی کے الفاظ میں

یہ بالکل صحیح ہے کہ ایک گروہ جس سے ہم ہرگز بات چیت نہیں کریں گے' وہ پی ایل او ہے۔ وجہ یہ نہیں کہ یہ شرپسند لوگ ہیں' اصل رکاوٹ ان کے ایجنڈے کا موضوع ہے۔ یہ موضوع مغربی حصے میں فلسطینی ریاست کے قیام کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ ایسی چیز ہے جو ہم ہرگز نہیں مان سکتے (ڈیوڈ کریوائن ہفت

روزہ اکنامسٹ لندن، ۱۰ جولائی ۱۹۸۴)

یہ سب تو فسانے ہیں، جو بڑی مہارت، چابک دستی اور فنکاری کے ساتھ گھڑے گئے ہیں، حقیقت کا روپ دیئے گئے ہیں، دنیا بھر میں پھیلائے گئے ہیں، گوبلز کے جھوٹ کی طرح دہرائے گئے ہیں، اور اہلِ مغرب کو باور کرائے گئے ہیں، کہ فلسطینی تو خود ہی فلسطین چھوڑ کر چلے گئے، عرب بشمول پی ایل او اسرائیل کا نام و نشان مٹانے کے درپے ہیں، مسلسل اس کے خلاف جنگ برپا کئے ہوئے ہیں، اسرائیل یکے بعد دیگرے اپنی بقا کی جنگیں لڑتا رہا ہے، اور پی ایل او ایک دہشت گرد گروہ سے زیادہ کچھ نہیں۔

حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ بن گوریان، بیگن اور شامیر جیسے دہشت گردوں کی سرکردگی میں دہشت گردی، شہریوں کے خلاف جنگ، ان کا قتل عام اور تعذیب جیسے ہتھ کنڈوں کے ذریعہ فلسطینیوں کو گھروں سے نکال کر باہر پھینکا گیا ہے۔ عربوں کی طرف سے امن اور صلح کی ہر پیش کش کو اسرائیل نے اپنے وجود کے لئے جنگ سے زیادہ بڑا "خطرہ" سمجھا ہے۔ ہر جنگ کا سامان اسرائیل نے خود کیا ہے، اور اپنی "بقا" کے لئے نہیں، اپنی "توسیع" کے لئے لڑی ہے۔ اسرائیل کے ہر "جُرم" پر امریکہ نے اس کو مزید اسلحہ اور ڈالر فراہم کر کے، اور اس کے خلاف قراردادوں کو ویٹو کر کے، اس کی پیٹھ ٹھونکی ہے۔

اسرائیل کی دہشت گردی، اور امریکہ کی طرف سے اس دہشت گردی کی مکمل پشت پناہی کی داستان بیان کرنے کے لئے تو کئی کتابیں بھی ناکافی ہوں گی۔ فلسطینی شہریوں کے خلاف جنگ اور دہشت گردی کا آغاز ۵ جنوری ۱۹۴۸ کو بیت المقدس کے عرب علاقے میں واقع سیمی رامیس ہوٹل کو ۱۷۵ پونڈ ڈائنا مائٹ سے اڑا کر کیا گیا۔ فلسطینیوں کو خوف زدہ کرنے کے علاوہ اس کارروائی کا کوئی اور مقصد نہیں ہو سکتا تھا۔ ۹ اپریل ۱۹۴۸ کو ۱۴ مئی کے قیام اسرائیل کے اعلان سے بھی پیشتر، یہودی دہشت گرد تنظیموں ارگون (Irgun) اور اسٹرن (Stern) کے ۱۰۰ مسلح جوان بیت المقدس کے مضافات میں ایک چھوٹے سے عرب گاؤں، دیریاسین پر حملہ آور ہو گئے، اور ۲۵۰ نہتے بچوں، عورتوں اور مردوں کو ان کے گھروں سے ڈائنامائٹ سے اڑا دیا۔ ارگون کے کمانڈر نے اپنی کامیابی کے مژدہ کا تار ان الفاظ میں بھیجا "جس طرح دیریاسین میں، اسی طرح ہر جگہ ــــ اے خدا! اے خدا! ــــ تو نے فتح ہمارے لئے مقدر کر دی ہے"۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مئی ۱۹۴۸ تک تین لاکھ فلسطینی اپنے گھروں سے نکل گئے۔ اس کے بعد قتل و غارت کا یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا،

اور لاکھوں فلسطینیوں کا مقدّر دربدر کی ٹھوکریں کھانا یا مہاجر کیمپوں میں پڑا رہنا بنتا گیا۔ پھر ۱۹۸۳ میں اسرائیل نے بیروت پر حملہ کر کے اور مہاجر کیمپوں میں قتل و غارت کا بازار گرم کر کے، فلسطینیوں کے "ارضِ اسرائیل" کی سرحدوں سے بہت دور نکل جانے کا سامان کر دیا۔

فلسطینیوں کو نکال دینے، پورے فلسطین پر قبضہ کر لینے، اور "ارضِ اسرائیل" قائم کرنے کے منصوبوں کو یہودی لیڈروں نے کبھی ڈھکا چھپا نہیں رکھا۔ یہ سب کارروائیاں اس لیے نہیں ہوئیں کہ عرب اسرائیل کو تسلیم کرنے کو تیار نہ ہوئے، یا اسرائیل سے برسرِپیکار رہے، بلکہ اس لیے ہوئیں کہ اسرائیل پورے فلسطین پر بلاشرکت غیرے قبضہ، اور پورے مشرقِ وسطیٰ پر اپنا تسلّط قائم کرنے کے لئے معرکہ آرا ہے۔ تقسیم فلسطین کا منصوبہ قبول کرتے وقت بن گوریان نے واضح کر دیا تھا کہ "ہم اردن پر اپنے حق سے دست بردار نہیں ہو رہے ہیں... ہم پورے ملک میں رہیں گے۔ عربوں کی رضا مندی سے ہو، یا دوسرے ذرائع اختیار کر کے... (اگر عرب نہ مانیں) تو پھر ہمیں ان سے ایک دوسری ہی زبان میں بات کرنا پڑے گی۔ جب ہماری ریاست بن جائے گی، تب ہی یہ دوسری زبان ہمارے قبضہ میں ہو گی"۔ اور بگین نے کہا کہ "وطن کی تقسیم غیر قانونی ہے، یہ کبھی تسلیم نہیں کی جائے گی... یروشلم ہمارا دارالسلطنت تھا، اور ہمیشہ رہے گا۔ ارضِ اسرائیل بنی اسرائیل کو واپس مل کر رہے گی۔ پوری کی پوری ہمیشہ ہمیشہ کے لئے"۔ اسرائیلی ملٹری انٹیلیجنس کے ایک سابق سربراہ کے الفاظ میں "مستقبل میں کسی جنگ کی صورت میں ہمارے پاس سات آٹھ لاکھ فلسطینیوں کو ان کے گھروں سے نکال دینے کا منصوبہ موجود ہے"۔

اس تاریخی پس منظر میں یہ دیکھنا بالکل مشکل نہیں کہ میڈرڈ کانفرنس سے کس کو کیا حاصل ہو گا، خصوصاً اگر اس کانفرنس کے بعد کے مراحل اپنے مزعومہ نتائج تک پہنچ جاتے ہیں۔

جہاں تک اہلِ فلسطین کا تعلق ہے، روز نامہ گارجین کے ڈیوڈ ہرسٹ کی یہ بات بالکل صحیح ہے کہ "اسرائیلی وزیراعظم شامیر نے اس کانفرنس میں شرکت کے لئے امریکہ سے جو شرائط منوا لی ہیں (یا باہم طے کر لی ہیں) وہ اس نوعیت کی ہیں کہ ان کا منطقی نتیجہ صرف ایک ایسا آخری تصفیہ ہی ہو سکتا ہے جس میں فلسطینیوں کا بحیثیت ایک قوم کے بالکل کوئی مقام نہ ہو، ایسی قوم جس کو ایک قوم کے معروف حقوق حاصل ہوں"۔ گویا میڈرڈ کانفرنس اگر ایک تصفیہ تک پہنچی تو وہ اہلِ فلسطین کا بھی آخری حل (فائنل سولوشن) ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ ملے گا تو وہ

یونسپلٹیاں چلانے کا اختیار ہو گا۔ یہ بھی اس لیے کہ اسرائیل اپنی حدود میں غیریہودیوں کی ایک عظیم تعداد کی موجودگی کے درد سر سے نجات حاصل کر سکے' اور اس کے دامن پر عربوں کی اتنی بڑی تعداد کو حقوقِ شہریت سے محروم کر دینے کے دھبے پر پردہ پڑ جائے۔

یہ شرائط کیا تھیں؟ فلسطینیوں کا کوئی وفد اس بات چیت میں شریک نہیں ہو گا۔ اگر فلسطینی شریک ہوں گے تو اردن کے وفد کی حیثیت میں۔ اردن کے وفد میں بھی جس فلسطینی کو اسرائیل شریک ہونے دے گا وہ بیت المقدس کا رہنے والا نہ ہو گا (کیونکہ بیت المقدس اب اسرائیل کا اٹوٹ انگ ہے۔ اگرچہ اسرائیل کے اس قبضہ کو دنیا نے' یہاں تک کہ امریکہ نے بھی' ابھی تک تسلیم نہیں کیا' مگر اب اس طرح تسلیم ہو گیا)' وہ کوئی جلا وطن فلسطینی بھی نہیں ہو گا' اس کا کسی قسم کا تعلق پی ایل او سے بھی نہیں ہو گا۔ پھر شامل ہو گا کون؟ جو مغربی حصہ اور اردن میں رہائش پذیر ہو' اور جس کا نام اسرائیل ویٹو نہ کرے۔ اس کی مثال حیدر شفیع جیسا فلسطینی ہے' جو سیکولر لیفٹسٹ ہے اور بنیاد پرستی اور انتفاضہ کا سخت مخالف ہے۔ دنیا میں گفت و شنید کی تاریخ میں شاید یہ پہلی نظیر ہو گی کہ ایک فریق اس بات پر بھی ویٹو کا حق رکھتا ہو کہ دوسرے فریق کی نمائندگی کون کرے گا۔

دوسرے شرکاء کے سلسلہ میں بھی اسرائیل اور امریکہ نے اپنے مفادات کے مطابق شرائط طے کیں۔ اقوام متحدہ کو بحیثیت مندوب کے شریک ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ بڑی عجیب بین الاقوامی کانفرنس تھی' جہاں خود اقوام متحدہ کو بھی پوری شرکت کی اجازت نہ ملی۔ وہی اقوام متحدہ جو امریکہ کی جنگِ خلیج کی پوری مدت میں آگے رکھی گئی۔ برطانیہ اور فرانس بھی اس میں شریک نہیں کیے گئے' حالانکہ ان کا مشرقِ وسطیٰ سے گہرا تعلق رہا ہے۔ یہ نتیجہ ہے کسنجر کی پالیسی کا' امریکہ کی پالیسی کا' کہ یورپ اور جاپان کو مشرقِ وسطیٰ کے بارہ میں بات چیت سے بالکل باہر رکھا جائے۔ روس کانفرنس بلانے میں امریکہ کے ساتھ شریک ضرور ہے' لیکن ایسے وقت جب اس کی طاقت اور موقف یکسر بدل چکے ہیں۔ اگر روس کی طاقت اور موقف میں تبدیلی نہ آئی ہوتی تو یہ کانفرنس کبھی نہ منعقد کی جاتی۔ درحقیقت یہ وہ بین الاقوامی کانفرنس ہے ہی نہیں جس کا مطالبہ عرب کر رہے تھے۔ میڈرڈ کانفرنس کے بعد' شامیر کے بیان کے مطابق' یہ سارے شرکا پھر کبھی بھی مل کر نہیں بیٹھیں گے' نہ اس کانفرنس کو کوئی اختیار حاصل ہے۔ کانفرنس کے بعد ہر عرب ریاست براہ راست اسرائیل سے مذاکرات کرنے کی پابند ہے۔ ایجنڈے کے بارہ میں بھی شرائط طے کی گئیں۔ "امن کے بدلے علاقے" چھوڑ دینے کا ذکر ہو گا'

لیکن یہ بات واضح رہے گی کہ اسرائیل ایک انچ زمین سے بھی دست بردار ہونے کو نہیں۔ فلسطینی شریک ہو سکیں گے' لیکن فلسطینی ریاست کا کوئی ذکر نہیں ہو گا۔

سیکولر فلسطینی جو کچھ میدان میں کھو چکے تھے وہی اب باقاعدہ میز پر اسرائیل کے حوالے کرنے کے لئے کانفرنس میں آبیٹھے ہیں۔ لیکن اب جن فتوحات پر خوشیوں کے شادیانے بجا رہے ہیں وہ بس اس قدر عظیم ہیں کہ (۱) اُردنی وفد میں شامل فلسطینی نمائندوں کی فہرست امریکی وزیر خارجہ بیکر نے اسرائیل کو باقاعدہ دکھا کر اس کی منظوری حاصل نہ کی (اگرچہ اسرائیل کو یقین دہانی کر دی گئی کہ کوئی فلسطینی مندوب ایسا نہیں جس پر ان کو اعتراض ہو سکے) (۲) میڈرڈ میں ان کا استقبال علیحدہ سے کیا گیا' ان کو لیموزین دی گئی ' اور پوری ڈپلومیٹک حیثیت بھی (۳) کانفرنس میں ان کو بولنے کے لئے اتنا ہی وقت دے دیا گیا جتنا اردن اور اسرائیل کے وفود کو۔

جہاں تک باقی عربوں کا تعلق ہے تو امریکہ کی جنگِ خلیج کے بعد اب وہ جس ضعف اور کسمپرسی کے عالم میں ان مذاکرات میں حصہ لے رہے ہیں' اس کے پیشِ نظر کچھ پانے کا تو سوال ہی نہیں' سب کچھ کھو کر 'جوئے میں ہار کر' ہی میز پر سے اٹھیں گے۔

تو ' امریکہ اور اسرائیل اس کانفرنس سے کیا' اور کس طرح حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ جب ایک طرف فلسطینی بہت ہی محدود اختیارات حاصل کرنے کے لئے اسرائیل کے سامنے ناک رگڑ رہے ہوں' تو تمام عرب ملک علیحدہ علیحدہ اسرائیل سے اپنی اپنی شرائط طے کر لیں۔ ان ممالک میں امریکہ کے پرانے یاران وفادار بھی ہیں' خلیج جنگ کے احسان کے بوجھ تلے دبے ہوئے حکمران بھی ہیں' وہ ملک بھی ہیں جو اپنے اوپر اللہ کے بعد (بلکہ شاید اس سے پہلے ہی) زمین پر امریکہ ہی کو اپنے لئے کافی سمجھتے ہیں' اور وہ بھی جو برملا اس بات کا اعلان کر چکے ہیں کہ فلسطینی اسرائیل سے کوئی معاملہ کریں نہ کریں ہم ضرور ہی کریں گے۔ امریکہ اور اسرائیل کا منصوبہ یہ ہے کہ اس طرح فلسطینی بالکل تنہا رہ جائیں گے۔ سارے فلسطین پر اسرائیل کا قبضہ رہے گا۔ ہر متعلقہ عرب ملک اسرائیل سے الگ الگ کوئی نہ کوئی معاہدہ کر ہی لے گا۔ لیکن اگر کسی سے کوئی معاملہ طے نہ ہو سکا ' تو خلیج جنگ کی طرح کسی اقتصادی و فوجی کارروائی سے اس کو سیدھا کر لیا جائے گا۔

اس طرح عرب ممالک جب اسرائیل سے امن کے معاہدوں میں بندھ جائیں گے تو ان کو غیر مسلح کیا جا سکے گا۔ ان کی معیشتوں کے دروازے بھی اسرائیل اور مغرب کے لئے کھول دیئے جائیں گے۔ اس طرح اسرائیل ' جس کو امریکہ سالانہ ایک ہزار ڈالر فی کس کے حساب سے

امداد دیتا ہے، جس کی فوجی طاقت دنیا کی چوتھی بڑی طاقت ہے، جس کے پاس کم سے کم دو سو نیوکلیئر بم ہیں، اور جو مغرب و امریکہ کے عزائم پورے کرنے کے لیے ہی بنایا گیا ہے، سارے مشرقِ وسطیٰ پر اپنا تسلط قائم کر لے گا۔ اس کو فوجی بالا دستی بھی حاصل ہو گی، اور علاقہ کی معیشت پر بھی اس کا کنٹرول ہو گا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے، دو طرفہ مذاکرات کے ساتھ ساتھ ایک علاقائی کانفرنس بھی اس منصوبہ میں شامل ہے۔ جہاں پانی، معیشت، ماحولیات، وغیرہ جیسے مسائل کے حوالے سے، کسی دو طرفہ معاہدہ سے پہلے ہی، عرب ممالک اسرائیل کے ساتھ نتھی ہو جائیں گے۔ عرب ممالک، کمزور و ضعیف، متفرق و منتشر، ایک دوسرے سے کٹے ہوئے اور ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرا، سیاسی طور پر اپنے ہی ملکوں کے عوام سے بیگانہ اور ان سے برسرِپیکار، اخلاقی طور پر دیوالیہ ۔۔ امریکہ اور اسرائیل کے دست نگر اور باجگزار بن کر رہیں گے۔ اور اسپین کے دور طوائف الملوکی کا نقشہ تازہ ہو جائے گا۔ پھر، اگر "بنیاد پرستی" سر اٹھائے گی، تو مسلمان حکومتیں خود ہی اس سے نپٹ لیں گی۔

امریکہ کی نیو ورلڈ ڈپلومیسی کا دائرہ کچھ مشرقِ وسطیٰ ہی تک محدود نہیں، اگرچہ مشرقِ وسطیٰ کے لیے اس کا منصوبہ اس ڈپلومیسی میں شہ رگ (لِنگ پن) کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر مسلمان ملک جو کسی طرح بھی طاقتور ہو، سرتابی کی مجال کرے، جہاں "بنیاد پرستی" کے سر اٹھانے کا خطرہ ہو، وہ دباؤ کی زد میں ہے۔ آج یا کل، جلد یا بدیر، اس کی باری آنیوالی ہے۔ پاکستان اور لیبیا پر دباؤ اسی ڈپلومیسی کا حصہ ہے۔

پاکستان سے امریکہ کے مطالبات بہت واضح ہیں۔ ایک یہ کہ وہ نیوکلیئر بم بنانے کا ارادہ ترک کر دے، اور اب تک اس سمت میں جتنی پیش رفت کی ہے اس کو لپیٹ کر پیچھے دھکیل دے، اپنی ساری ایٹمی تنصیبات اور پروگراموں کو بین الاقوامی (یعنی امریکی) معائنہ کے لئے کھول دے۔ (جیسا "بین الاقوامی" معائنہ آج کل عراق میں ہو رہا ہے)۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو پرسلر ترمیم کے تحت ۔۔۔ جو خاص پاکستان ہی کے لئے وضع کی گئی ہے ۔۔۔ اس کی ساری امداد، (جو امداد سے زیادہ قرض کا جال ہے)، یہاں تک کہ طلبہ کے وظائف تک، تو بند کی ہی جا چکی ہے، دوسرے ممالک سے بھی یہی کچھ کرایا جائے گا۔ تجارت کے راستے بند کئے جائیں گے۔ دنیا میں اس کو یکہ اور تنہا کر کے چھوڑا جائے گا۔ ایٹمی تنصیبات کی تباہی کے لیے، بھارت اور اسرائیل سے اچانک محدود حملے بھی کرائے جا سکتے ہیں۔ یا بھارت سے جنگ بھی چھڑوائی جا سکتی ہے، تاکہ

سرتابی کا مزہ چکھایا جا سکے۔

دوسرے یہ کہ وہ کشمیر میں جہاد کی حمایت بالکل ترک کر دے اور مجاہدین کی ہر قسم کی امداد سے دست کش ہو جائے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اسے دہشت گرد قرار دے کر اس کے خلاف مختلف النوع اقتصادی' سیاسی' اور فوجی کارروائیوں کا راستہ کھول دیا جائے گا۔

تیسرے یہ کہ وہ افغانستان میں کسی اسلامی حکومت کو برسر اقتدار لانے کا خیال ترک کر دے۔ ویسے تو ایسی حکومت دنیا میں کہیں بھی قابل قبول نہیں' اور ہر جگہ مغربی تہذیب کے لئے ایک خطرہ ہے' لیکن افغانستان میں تو خاص طور پر بالکل ہی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ اس طرح ترکی' ایران' افغانستان اور وسط ایشیا کی وہ مسلمان ریاستیں جن پر روس نے قبضہ کر لیا تھا آپس میں مل کر' مشرق وسطی کے بعد' مسلمانوں کا دوسرا اہم اور زیادہ طاقتور بلاک بن سکتے ہیں۔ افغانستان کو اس وسیع' اہم' اور حساس علاقہ میں کلیدی مقام حاصل ہے۔ پھر' اب بچے کھچے' شکستہ و پراگندہ' روس کا تحفظ بھی نیو ورلڈ آرڈر کے ایجنڈے پر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خصوصاً" وسط ایشیا کی مسلمان ریاستوں کے آزاد اور طاقتور ہو جانے کے خطرے سے۔ بالٹک ریاستوں کی آزادی فوراً تسلیم کر لی جا سکتی ہے' دوسری ایسی ریاستوں کی آزادی پر بھی حمایت یا خاموشی اختیار کی جا سکتی ہے' لیکن مسلمان ریاستوں کی آزادی کے ذکر سے ہی خطرے کے الارم بجنے لگتے ہیں۔

چوتھے' پاکستان اس علاقے میں کسی وسیع تر مسلمان بلاک کا خواب دیکھنا چھوڑ دے' اور مغرب و شمال کی طرف دیکھنے کی بجائے مشرق کی طرف دیکھے' اور بھارت کی بالادستی کے تحت زندگی بسر کرنا قبول کر لے۔ یہ کوئی غیر اہم بات نہیں ہے کہ محض ایک پاکستانی وفد کے وسط ایشیا جانے' اور ثقافتی' اقتصادی اور سیاسی روابط بڑھانے کے لئے پہلا قدم اٹھانے کے ساتھ ساتھ یہ بریفنگ اخباروں میں آجائے کہ اس اقدام سے امریکہ کو سخت تشویش ہے' اور وہ پاکستان اور وسط ایشیا کے درمیان روابط کے بڑھنے کو پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتا۔

دوسرا معاملہ لیبیا کا ہے۔ صدر قذافی کے استبداد یا بیرون ملک غیر قانونی کارروائیوں کی تائید ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ لیبیا کے اندر اور باہر' لیبیا کے باشندوں یا بے گناہ انسانوں کو ہلاک کرنے کی کارروائیوں کی یقیناً" مذمت کرنا چاہیے۔ لیکن امریکہ اور دیگر مغربی طاقتوں نے دھونس اور تشدد کی جو پالیسی لیبیا کے ساتھ اختیار کر رکھی ہے' وہ کم قابلِ مذمت نہیں۔ لیبیا کی غلط کارروائیاں امریکہ کو یہ جواز فراہم نہیں کرتیں کہ وہ اپنی فوجی قوت کے ساتھ اس پر چڑھ

ڑے، اور بے گناہ عورتوں اور بچوں اور مردوں کو ہلاک کرے۔ یہ کام وہ پہلے بھی کرچکا ہے، اب پان امریکن کے جہاز کی تباہی کی تحقیقات کے نتائج کا اچانک انکشاف کرکے لیبیا کے ف فوجی کارروائی کے لئے زمین ہموار کی جا رہی ہے۔ اس لیے کہ لیبیا نیو ورلڈ آرڈر کی راہ ، ایک کانٹا ہے۔ ورنہ پان امریکن کے جہاز کے تو ٹکڑے ٹکڑے جمع کرکے ان پر لیبیا کا نام ہ لیا گیا، مگر ۱۷ ستمبر ۱۹۴۸ کو فلسطین میں اقوام متحدہ کے نمائندے کاؤنٹ برناڈوٹ کو اسرائیلی ہشت گردوں نے ' یروشلم کے یہودی علاقے میں ایک روڈ بلاک پر 'گولی مار کر ہلاک کر دیا' خود امریکن کونسل واسن کو ۲۶ مئی ۱۹۴۸ کو گولی مار دی گئی' بہاولپور کے نزدیک جہاز تباہ کرکے نہ صرف پاکستان کے صدر اور اس کے جنرلوں کو ہلاک کر دیا گیا بلکہ امریکن سفیر اور فوجی اتاشی بھی ہلاک ہو گئے' اسرائیل رات دن نہتے فلسطینیوں کو ختم کر رہا ہے' نہ تحقیقات ہوتی ہیں' اگر ہو جائیں تو نہ ان کے نتائج کا اعلان ہوتا ہے 'نہ مقدمہ چلتا ہے' نہ دہشت گرد پکڑا جاتا ہے' نہ کوئی اور کارروائی کی جاتی ہے۔

صدام حسین نے کویت پر حملہ کرکے' اور پھر امریکی فوجیوں کے سامنے بلا مزاحمت ہتھیار ڈال کر جس طرح نیو ورلڈ ڈپلومیسی کی کامیابی کی راہ ہموار کی ہے' اس کے صلہ میں اس کا اقتدار تو اب تک سلامت ہے۔ مگر عراق کی فوجی قوت کی مکمل تباہی ' اس کی معیشت کی شکست و ریخت ' اور عراقی عوام کو بھوک اور بیماری سے ہلاک کرنے کے لئے جو بے رحمانہ کارروائی جاری ہے' وہ بھی اسی منصوبہ کا ایک حصہ ہے۔ دنیا اگر اس پر خاموش ہے تو کیا گلہ کیا جائے' ماتم کا مقام تو یہ ہے کہ وہ مسلمان جن کی زبانیں کویت پر عراقی جارحیت کے خلاف شمشیر برہنہ تھیں' اب عراق کے خلاف امریکہ کی چیرہ دستیوں پر گنگ ہیں۔

۱۴۹۱ اچانک پیش نہیں آگیا تھا۔ نہ ۱۹۹۱ اچانک نمودار ہو گیا ہے۔ یہ دنیا اندھیر راجا کی اندھیر نگری نہیں ہے۔ نہ یہ کسی حادثہ اور اتفاق کی پیداوار ہے' نہ یہاں تدبیر امر اور لیل و نہار کی گردش حادثہ اور اتفاق کے نتیجہ میں ہوتی ہے۔ یہ دنیا حق پر پیدا کی گئی ہے ' حق پر قائم ہے۔ یہاں آسمان سے زمین تک تدبیر امر اس کے ہاتھ میں ہے جو رب العالمین ہے' عالم الغیب والشھادہ ہے' عزیز و رحیم ہے' حکیم و حمید ہے۔ اسی کی سنت یہاں کارفرما ہے۔ **وَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا . . . تَحْوِيلًا**۔ اس لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ کل جو کچھ ہوا تھا' وہ کیوں ہوا تھا' اور آج کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے۔ قوموں کے لئے کوئی ایسا مستقبل اس طرح

مقدر نہیں کہ اس سے مفر ممکن نہ ہو' جس کا ظہور پذیر ہونا ناگزیر ہو۔ ہاں' سنت اللہ سے مفر ممکن نہیں۔ جو کچھ کھویا وہ اس سنت کے تحت' جو کچھ پا سکتے ہیں وہ بھی اسی سنت کے تحت۔

اسپین میں مسلمانوں کے ۷۸۱ سالہ تہذیبی تفوق اور سیاسی غلبے کا دور حرفِ غلط کی طرح کیوں مٹ گیا؟ پہلا بڑا سبب ان کا باہمی افتراق و انتشار' نزاع و جدل' اور جنگ و خون ریزی ہے۔ عصبیت کی وجہ سے بھی' اقتدار و حکومت کے لالچ کی وجہ سے بھی' عیش و عشرت اور دولت و دنیا کی طلب و ہوس کی وجہ سے بھی۔

اسپین کے مسلمانوں میں تین گروہ تھے۔ ایک طرف عرب تھے' تو دوسری طرف بربر' اور تیسری طرف اسپینی مسلم (جو یا تو مخلوط اولاد تھے یا بالکل نو مسلم' اور مولدون کہلاتے تھے)۔ خود عرب' کلبی و قیسی' یمنی و شامی وغیرہ' بے شمار گروہوں میں تقسیم تھے۔ سب قبیلوں اور گروہوں کے درمیان مستقل آویزش اور کشمکش تھی۔ سب کو ایک دوسرے سے سیاسی' معاشی اور تہذیبی شکایات تھیں۔ نو مسلموں کو پیدائشی مسلمانوں سے' غیر عربوں کو عربوں سے' فرق و امتیاز اور استحصال کا گلہ تھا۔ جوڑ توڑ اور سازشیں بھی تھیں' کشت و خون بھی۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف فرانس کے میدانوں میں شکست کھائی' اور پیش قدمی رک گئی۔ دوسری طرف شیرازہ بار بار بندھتا اور پھر بکھرتا رہا۔ ہر افتراق و انتشار سے وہ عیسائی حکمران بھرپور فائدہ اٹھاتے جن کی ریاستیں شمال میں موجود تھیں۔ اور وہ بھی جو مسلم اسپین کے باشندے تھے۔

۷۱۱ میں طارق بن زیاد کی فتح اسپین کے بعد سے ہی قتال و جدال کا یہ سلسلہ چھڑ گیا' اور نصف صدی تک جاری رہا۔ یمنی گورنر مارا جاتا یا معزول کیاجاتا تو قیسی آتا' وہ جاتا تو یمنی آتا۔ اموی دور ۱۰۳۰ میں ختم ہوا' مگر آخری ۲۲ سال میں ۱۰ حکمران تخت پر بیٹھے۔ ان کے خاتمہ کے ساتھ ہی اسپین میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوگئیں۔ مرابطین اور موحدین کے ادوار آئے' لیکن ان باہم برسرپیکار چھوٹی ریاستوں سے جان نہ چھوٹی۔

باہمی نفاق و افتراق اور کشت و خون سے فائدہ اٹھاکر عیسائی حکمران اپنا اقتدار وسیع اور مستحکم کرتے رہے۔ ایک مسلمان ریاست کو دوسری مسلمان ریاست سے لڑاتے رہے۔ کبھی ایک کی پشت پناہی کرتے' کبھی دوسرے کی۔ اس طرح ایک ایک کر کے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ہڑپ کرتے رہے۔ بالآخر ۱۲۳۸ میں صرف غرناطہ کی ایک چھوٹی سی ریاست باقی رہ گئی۔ ۱۴۹۱ میں وہ بھی اپنے آخری انجام سے دوچار ہوگئی۔

عیسائیوں کو تو مسلمان قبیلوں اور ریاستوں کے باہمی جنگ و جدل سے فائدہ اٹھانا ہی تھا'

بڑی المناک داستان تو مسلمانوں کے خود عیسائیوں سے مدد لینے ' ان کا آلۂ کار بننے ' ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں ہی کو تباہ و برباد کرنے کی داستان ہے۔ تاریخ اسی دلخراش کہانی سے بھری ہوئی ہے۔ یوسف بن تاشفین آیا تو مسلمان ریاستوں نے مل کر عیسائیوں کو اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لیے پکارا۔ اشبیلیہ کے لوگوں نے عیسائیوں کے دربار میں ایک مسلمان فوجی افسر کو لکھا کہ "عیسائیوں کے بادشاہ کو ہماری فریاد سناؤ' اور اس کی مدد حاصل کر کے مرابطین کا جوا ہمارے کندھوں سے اتروا دو۔ مرابطین سے آزادی کے بعد ہم عیسائی بادشاہ کو سابق سے زیادہ خراج ادا کریں گے"۔ قرطبہ کے امرا کہتے تھے کہ "بادشاہ لیون سے مل جاؤ اور حسب دستور سابق اس کو خراج دو۔ ان مرابطین سے گلو خلاصی کی جو تدبیر ہوگی وہ اچھی ہوگی"۔

سب سے زیادہ جگر خراش تو غرناطہ کے آخری ایام کی کہانی ہے۔ مولائے حسن وہ آخری حکمران تھا جس نے عیسائیوں کو خراج دینے سے انکار کر دیا۔ جب مسلمان زندگی اور موت کی لڑائی لڑ رہے تھے تو عیسائیوں نے اس کے دونوں بیٹوں ' ابوعبداللہ محمد اور یوسف سے اس کے خلاف بغاوت کروا دی۔ اس نے اپنے بیٹے کو شکست تو دے دی ' لیکن عیسائیوں کے مقابلے سے دست کش ہونا پڑا۔ تنگ آکر جب اس نے حکومت اپنی بھائی الزاغل کے حوالے کر دی ' تو عیسائیوں نے ابوعبداللہ کو مسلح کر کے اس کے خلاف کھڑا کر دیا۔ الزاغل کس کس کا مقابلہ کرتا۔ ایک شہر پر ابوعبداللہ کا قبضہ ہوتا ' تو دوسرے پر فرڈی ننڈ کا۔ اس نے بھی اپنے بھتیجے سے بچنے کے لیے فرڈی ننڈ کے ساتھ صلح کرلی۔ مگر بالاخر الزاغل اور ابوعبداللہ دونوں ہی جلا وطن ہو کر کسمپرسی کی زندگی اور موت سے دوچار ہوئے۔

اس کے ساتھ ساتھ مسلمان حکمرانوں اور امرا میں بے شمار عیسائیوں کے ایجنٹ تھے۔ اس وقت عیسائیوں کی تہذیبی و ذہنی غلامی کا تو کوئی سوال نہ تھا' لیکن سیم و زر کے عوض ان کے ضمیر اور زبانیں خرید لی گئی تھیں۔

مسلمان حکمران عیسائیوں سے ساز باز کرتے 'عوام کو بے خبر رکھا جاتا ' اور پھر ان کو بھیڑ بکری کے ریوڑوں کے طرح ہانک دیا جاتا۔ علما و فقہا فتوے جاری کرتے' مگر ان کی کوئی نہ سنتا۔ مسلمان عوام پیچ و تاب کھاتے' لیکن بے بس و لاچار خاموش تماشائی بنے رہتے۔

۱۹۹۱ نمودار ہونے کے اسباب اور آج کی صورت حال کیا ۱۴۹۱ سے کچھ زیادہ مختلف ہے؟

عرب ترکوں کے خلاف' مصری یمن میں ' عراق اور کویت ' پنجابی اور بنگالی ---------

مسلمان ہی ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف معرکہ آرا ہوتے رہے ہیں' اور ہو رہے ہیں۔ مغرب

کی سیکولر عیسائی قوتیں ان کو پارہ پارہ کرتی رہی ہیں' اور اپنا زیر نگیں بناتی رہی ہیں - میڈرڈ کانفرنس امریکہ کی جنگ خلیج کے پس منظر میں شروع ہوئی - اس میں عرب کو عرب کے 'یا صحیح معنوں میں مسلمان کو مسلمان کے' خلاف لڑایا گیا- مغرب کے سارے ممالک نے مل کر پہلے عراق کی طاقت کا ہوّا کھڑا کیا' پھر اس کو تباہ و برباد کر دیا - اردن میں "سیاہ ستمبر" کا فلسطینیوں کا قتلِ عام ہو' یا لبنان میں شام کی فوجی کارروائی ' بیروت کے کیمپوں میں فلسطینیوں کا قتلِ عام ہو یا غزّہ میں ان کی پکڑ دھکڑ ' یہ مسلمان ہی ہیں جو مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہیں- اگر مصر کیمپ ڈیوڈ میں پہلے ہی فلسطینیوں کو چھوڑ چکا ہو' اور کویت و سعودی عرب برملا اعلان کریں کہ فلسطینی آئیں یا نہ آئیں ہم اسرائیل سے ضرور صلح کریں گے ' تو فلسطینی کیوں پیچھے رہتے-

عصبیّت کی پُوجا ' باہمی افتراق اور جنگ و جدال ' غیروں کی کاسہ لیسی ---- یہ سب خود ایک بنیادی مرض کا نتیجہ ہیں- اور وہ یہ کہ مسلمان امت اپنے اصل مقصد و مدعا' اپنے مشن ' بلکہ کسی قسم کے بھی مقصد و مشن سے خالی ہوگئی- حبل اللہ چھوڑ کر ' اس کو حبل الناس کے علاوہ کوئی سہارا نظر نہیں آتا-

اللہ تعالیٰ کا فرمان تھا کہ "صرف خدائے واحد کی پرستش کرو" ----- ہم نے نسل ' رنگ ' قبیلے' زبان جیسے بتوں کی پوجا شروع کروی - جس آگ کے گڑھے سے اس نے ہم کو نجات دی تھی' ہم جا کر سر کے بل اسی میں گر گئے- اس کا حکم تھا کہ "آپس میں جھگڑا نہ کرنا ' ورنہ کمزور پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی"- ہم نے تنازعات کی جنگ چھیڑ دی- پھر ہم کمزور بھی پڑ گئے اور ہماری ہوا بھی اکھڑ گئی - اس کے نبیؐ کا ارشاد تھا "کہ دیکھو ' میرے بعد کافر نہ ہوجانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو-" ہم نے مسلمان کو مسلمان بھائی کے بجائے اموی اور عباسی 'عربی اور عجمی ' عرب اور بربر' یمنی اور مصری ' عرب اور ترک ' پنجابی اور بنگالی ' سندھی اور مہاجر ' عراق اور کویت بنا کر بے دریغ ایک دوسرے کا خون بہایا-

اس نے یہ بھی فرمایا تھا کہ باہمی عداوت و بغض کا پھیلنا تو اس بات کی سزا ہے کہ جو ہدایت تم کو دی گئی ہے' اور جس کی دعوت و غلبے کا مشن تمہارے سپرد کیا گیا ہے' تم اس کو فراموش کر دو- ہم نے بالکل یہی کیا ' اور عیسائیوں کی طرح عداوت و بغض کا شکار ہوگئے- پھر ان کے لئے ہمارے شہروں کے دروازے کھل گئے' اور وہ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک ہر جگہ ہمارے اندر گھس کر ہمارے آقا و مالک بن گئے- اس نے خبردار کر دیا تھا کہ جو ہم سے نقضِ میثاق کے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں' ہم ان کے دل سخت کردیتے ہیں ' ان پر لعنت کرتے ہیں ' اور ان پر

باہر کی قوموں کو چڑھا لاتے ہیں۔ ہم نے نقضِ عہد کیا' تو ہم پر اس کے یہ سارے مواعید صادق ہوگئے۔

بظاہر تو حالات تاریک اور مایوس کن ہیں۔ امکان یہی ہے کہ ابھی اور زیادہ تاریک تر اور مایوس کن ہی ہوں گے۔ لیکن ۱۹۹۱' ۱۴۹۱ نہیں ہے۔ گھٹا ٹوپ اندھیروں میں روشنی کی شعاعیں بھی چمک رہی ہیں۔

آج مسلمان عروج کے بعد زوال کی پستی میں نہیں گر رہے' بلکہ زوال کی پستی کے بعد ان میں بیداری کی ایک لہر بڑھ رہی ہے۔ انکی بیداری کی یہ لہر ہی مغرب' امریکہ' اور اسرائیل میں اضطراب و بے چینی اور نیو ورلڈ آرڈر کا اصل باعث ہے۔ یہ لہر اب سیکولر عناصر کی رہنمائی میں مغرب کے سیاست تسلط سے برائے نام آزادی کی لہر نہیں ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں سید مودودیؒ' حسن البناؒ شہید اور ان جیسے بے شمار دیگر رہنماؤں کی جدوجہد کے نتیجہ میں "آج دنیا کے چپہ چپہ پر مردوں اور عورتوں کی' بالخصوص نوجوانوں کی' نسلیں کی نسلیں جنم لے چکی ہیں' جو اللہ اور رسولؐ سے اپنے عہد وفا کو وفا کرنے کی سعی و جہد میں لگی ہوئی ہیں۔ امریکہ کے غلبے کے' نااہل اور بیرونی تہذیب و قوت کے ایجنٹ یا پرستار حکمرانوں کے' ہر مسلمان ملک میں خود ان کے حکمرانوں کے طرف سے مسلمان عوام کو ظلم و استبداد کی زنجیروں میں جکڑ کے بے بس و ناکارہ بنانے کی کوششوں کے باوجود یہ لہر بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

اس لہر کی علامتیں بے شمار ہیں۔ اسلامی تحریکیں آگے بڑھ رہی ہیں۔ خود امریکہ اور یورپ میں اسلام کی دعوت کا کام ہو رہا ہے۔ نئی نسلوں کی اسلام سے وابستگی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ افغانستان میں' حوصلہ شکن نااتفاقیوں اور "ہنوز دلّی دوراست" کے باوجود' نہتے مجاہد ایک سپر پاور کو ہزیمت اور شکست و ریخت سے دوچار کرچکے ہیں۔ ایران کے انقلاب میں کتنی ہی خامیاں سہی' اس نے یہ ثابت کر دیا کہ اسلام میں اب بھی اتنی قوت ہے کہ وہ ایک پوری قوم کو کھڑا کر دے اور بیرونی طاقتوں کے ایک زبردست مہرے کو اٹھا کر پھینک دے۔ کشمیر کے بے سرو سامان اور بے سہارا مسلمان بھی جہاد کی راہ پر گامزن ہیں۔ وسط ایشیا کی ریاستوں میں مسجدیں بھرتی جا رہی ہیں' اور دین سے تعلق دن رات فزوں تر ہو رہا ہے۔

ادھر' امریکہ بھی معاشی طور پر کمزور ہو رہا ہے۔ اس کی بالادستی کو چیلنج کرنے والی قوتیں اٹھ رہی ہیں۔ خود امریکی اصحاب فکر سنجیدگی کے ساتھ جاپان کے ساتھ ایک جنگ کی پیشین گوئی

کر رہے ہیں۔ یورپ بھی امریکہ کا حریف بننے کی راہ پر آگے بڑھ رہا ہے۔ امریکہ ہی واحد قطب ہو' یہ امکان روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔

مگر سنت اللہ کے تحت یہ نہیں ہوتا کہ روشن مستقبل کا پھل من و سلوی کی طرح خود بخود کسی قوم کی جھولی میں ٹپک جائے۔ اگر من و سلوی بغیر استعداد کے برسنے بھی لگے' تو مسور اور پیاز لہسن کی کشش ذلت و مسکنت کے گڑھے ہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اس لیے بامِ عروج کا کوئی راستہ سعی و جہد کی علاوہ نہیں۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی' اللہ تعالیٰ کا ازلی و ابدی قانون ہے۔

اس لئے اس بھنور سے نکلنے کے لئے امت مسلمہ کو کمر کس کے کھڑا ہونا ہوگا۔ جو چیلنج درپیش ہیں ان کی نوعیت و حقیقت کا ادراک کرنا ہوگا۔ ان کا مؤثر جواب تیار کرنا ہوگا۔ یہ سمجھنا ہوگا کہ جو کچھ ہوا ہے وہ کیوں ہوا ہے' اور جو کچھ ہورہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے۔ اپنے گھروں کو ٹھیک کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ جو خود کو نہ بدلیں' ان کی حالت کبھی نہیں بدل سکتی ۔ حکمت و تدبر ' دلیری و جرات اور اجتہاد و جہاد کے ذریعہ اپنا راستہ بنانا ہوگا۔ اس یقین سے سرشار ہو کر اپنی حکمت عملی بنانا ہوگی کہ ہمارے پاس ایک ایسی دعوت ہے جو کڑے سے کڑے دشمن کو بھی مسخر کر سکتی ہے۔ اتنے بڑے دشمن کا مقابلہ صرف نفرت اور گالیوں' نعروں اور مظاہروں سے نہیں کیا جاسکتا۔ ضروری نہیں کہ جو دشمن ہے' وہ ہمیشہ دشمن رہے۔ عمر بن الخطابؓ ہوں' یا ہلاکو خان کی اولاد' کعبہ کو صنم خانوں سے پاسبان ملتے رہے ہیں اور مل سکتے ہیں۔

امت کو ایک عظیم چیلنج درپیش ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ چیلنج ان کے لیے ہے جو اسلام کے علمبردار ہیں' جو احیائے اسلام کے داعی ہیں' اور جو اقامتِ دین کے دعویدار ہیں۔ کیا وہ ایمان و عمل' فکر و نظر اور اجتہاد جہاد کے ذریعہ اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے آگے بڑھیں گے؟

امیر جماعت قاضی حسین احمد صاحب کی ہدایت پر نیو ورلڈ آرڈر کے موضوع پر پروفیسر خورشید احمد صاحب تفصیلی اشارات تحریر کر رہے ہیں۔ پہلی قسط ماہ اکتوبر کے شمارہ میں آچکی ہے۔ پروفیسر خورشید احمد صاحب اپنی علالت کی وجہ سے بقیہ قسطیں نہ لکھ سکے ہیں' اس لیے اس شمارہ کے لئے' امیرِ جماعت کی ہدایت پر' خرم مراد صاحب نے میڈرڈ کانفرنس کے موضوع پر اشارات لکھے ہیں۔ ان اشارات کا تعلق بھی نیو ورلڈ آرڈر کے موضوع سے ہے' لیکن انشاء اللہ پروفیسر خورشید احمد صاحب کی باقی ماندہ قسطیں بھی جلد حاضرِ خدمت کی جائیں گی۔ (ادارہ)